محمد الیاس خان

تاجک بحران: سنجیدہ مصالحتی کوششوں کی ضرورت

اکتوبر کے آخری عشرے میں پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں تاجکستان کے حکمرانوں اور حزبِ مخالف کے درمیان امن مذاکرات کا تیسرا دور منعقد ہوا۔ اس سے قبل امن مذاکرات کے دو دور ماسکو اور تہران میں منعقد ہو چکے ہیں۔ مذاکرات کے اس تیسرے دور میں پہلے سے طے شدہ جنگ بندی کے معاہدہ کی مدت میں ۶ فروری ۹۵ء تک توسیع کی گئی۔ واضح رہے کہ تہران میں طے پانے والی جنگ بندی معاہدہ کی مدت ۶ نومبر ۹۴ء کو ختم ہو رہی تھی۔ اسلام آباد مذاکرات کے نتیجے میں، جنگ بندی معاہدہ میں توسیع کے علاوہ، درج ذیل اہم نکات پر اتفاق کیا گیا۔

۱۔ جنگ بندی کی نگرانی کے لیے ۱۱ ممبران پر مشتمل ایک کمیشن قائم کیا جائے گا جس میں حکومت اور حزب مخالف دونوں کی طرف سے پانچ پانچ ارکان شریک ہوں گے۔ گیارہواں ممبر اقوام متحدہ کی نمائندگی کرے گا۔

۲۔ فریقین کے درمیان بین الاقوامی ریڈکراس کمیٹی کے زیراہتمام ۲۷ قیدیوں کا تبادلہ کیا جائے گا۔

۳۔ قیدیوں کا تبادلہ نہ ہونے کی صورت میں جنگ بندی معاہدہ منسوخ تصوّر کیا جائے گا۔

۴۔ مذاکرات کا چوتھا دور دسمبر میں ماسکو میں منعقد کیا جائے گا۔

۵۔ ۱۷ مبصرّین پر مشتمل اقوام متحدہ کی ایک ٹیم جنگ زدہ علاقہ میں تعینات کی جائے گی جو جنگ بندی شرائط کے نفاذ کی نگرانی کرے گی۔

اسلام آباد میں منعقد ہونے والے تاجک امن مذاکرات کے اس تیسرے دور کے دوران کئی بار ایسے مواقع آئے کہ مذاکرات کے نتیجہ خیز ہونے کے بارے میں ہر قسم کی اُمیدیں ناپید نظر آنے لگیں۔ لیکن، کہا جاتا ہے، کہ پاکستانی وزیر خارجہ جناب آصف احمد علی، سیکرٹری خارجہ اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے خصوصی ایلچی برائے تاجکستان جناب رمیرو پیریز بالون کی انتھک سفارتی کوششوں کے نتیجہ میں مذاکرات کو مکمل طور پر ناکام ہونے سے بچالیا گیا۔ مذاکرات میں ڈیڈلاک کیونکر پیدا ہوئے اور کیوں کر انہیں مکمل طور پر ناکام ہونے سے بچایا گیا؟ ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے

سب سے پہلے اسلام آباد مذاکرات کے لیے طے شدہ ایجنڈہ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اسلام آباد مذاکرات میں جن مسائل پر گفتگو کرنا طے پایا تھا ان میں درج ذیل اہم اُمور شامل تھے۔

۱۔ دیرپا اور مستقل جنگ بندی معاہدہ پر دستخط

۲۔ پارلیمنٹ اور صدر کے انتخاب کے لیے نئے آئین کی تشکیل

۳۔ تاجک مہاجرین کی گھروں کو واپسی اور روسی فوجوں کا انخلاء

مذاکرات کے اس ایجنڈے پر بات چیت آگے بڑھانے میں سب سے بڑی رکاوٹ تاجک حکومت کی طرف سے ۶ نومبر کو صدارتی انتخابات اور صدر کے عہدہ کی بحالی کے لیے ریفرنڈم منعقد کروانے پر اصرار تھا۔ حزبِ اختلاف نئے آئین کی تشکیل اور مہاجرین کی ملک واپسی سے قبل صدارتی انتخابات اور ریفرنڈم کے انعقاد کو مسئلے کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے مترادف سمجھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تہران میں طے پانے والے جنگ بندی معاہدہ کی مدت ۶ نومبر (انتخابات کے انعقاد کی تاریخ) تک رکھی گئی۔

تاجکستان میں پائیدار امن کے قیام کے لیے حزبِ مخالف کے زعماء ایک واضح تصوّر رکھتے ہیں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ۶ نومبر کو منعقد کرائے جانے والے صدارتی انتخابات اور ریفرنڈم کو ملتوی کیا جائے، اور پارلیمنٹ اور حکومت کو معزول و برخواست کر کے ایک ایسی قومی حکومت تشکیل دی جائے جس میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کو مساوی نمائندگی حاصل ہو اور جو دو سال کے عرصے میں نئے آئین کی رو سے نئے انتخابات منعقد کروانے کی پابند ہو۔ مذاکرات کے دوسرے دور (منعقدہ تہران) میں تاجک حکومت میدانِ جنگ میں حزبِ مخالف کو حاصل ہونے والی نئی عسکری کامیابیوں کے سبب زبردست دباؤ میں تھی اور اس نے ان تمام اُمور پر مذاکرات کے تیسرے دور میں بات چیت کرنے پر رضامندی ظاہر کرلی تھی۔ مزید یہ کہ تاجک حکومت نے حزبِ مخالف کی طرف سے صرف چالیس جنگی قیدیوں کے بدلے میں ان کے ۵۲ قیدیوں کو رہا کرنے کی حامی بھی بھرلی تھی۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ تہران مذاکرات کے دوران تاجک حکومت کا مقصد جنگ بندی معاہدہ کے ذریعہ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے محض وقت کا حصول تھا۔ چنانچہ ۲۰ اکتوبر سے اسلام آباد میں شروع ہونے والے مذاکرات میں تاجک حکومت نے نہ صرف یہ کہ ۶ نومبر کے صدارتی انتخابات اور ریفرنڈم کے التواء پر بات چیت کرنے سے انکار کردیا بلکہ قیدیوں کے تبادلے سے متعلق تہران معاہدہ کو بھی پس پشت ڈال دیا۔

حزبِ اختلاف کی سیاسی جماعتوں کی قانونی حیثیت کی بحالی، نئے آئین کی تشکیل، پریس کی آزادی کی بحالی اور حزبِ اختلاف کے ارکان کے خلاف قائم مقدمات واپس لینے جیسے بنیادی مسائل پر بات چیت سے مسلسل انکار اور پرانے نظام اور آئین (جو مسئلہ کی اصل جڑ ہے) کے تحت، حزبِ مخالف کے لاکھوں حامیوں کی ملک واپسی سے قبل اور حزبِ اختلاف کو آزادانہ طور پر مسلّمہ جمہوری اُصولوں کے تحت

انتخابات میں حصّہ لینے کا موقع فراہم کیے بغیر صدارتی انتخابات کے انعقاد اور ایک ریفرنڈم کے ذریعہ صدر کے عہدہ کی بحالی پر اصرار تاجک حکومت کے عزائم کو اشکار کرتا ہے۔ واضح طور پر دوشنبے میں برسراقتدار رحمانوف کی حکومت، روس اور مغرب کی آشیر باد سے، ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا ہے جس کے مقاصد میں ایک طرف مذاکرات کے عمل کو طویل تر کر کے حکومت پر اپنی گرفت کو مستحکم کرنا اور اس دوران مسلسل ایسے اقدامات اٹھانا شامل ہے جن سے روسی فوجوں کی امداد سے جمہوری طور پر منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر ناجائز قبضہ قائم کرنے والی حکومت کے وجود کو مصنوعی جواز فراہم کیا جاسکے۔ اور دوسری طرف مسئلہ کے پُرامن تصفیہ کے لیے مذاکرات جاری رکھنے پر مسلسل رضامندی ظاہر کرنے لیکن درحقیقت اصل اور بنیادی مسائل پر بات چیت سے مسلسل پہلوتہی کے ذریعہ حزبِ مخالف کو آخر کار ایک بار پھر مذاکرات سے مایوس ہو کر واحد دستیاب حل یعنی مسلح جدوجہد جاری رکھنے کے اعلان پر مجبور کرنا ہے۔ تاکہ ایک طرف بین الاقوامی رائے عامہ کو یہ تأثر دیا جاسکے کہ حزبِ مخالف دہشت گردوں اور مذہبی انتہا پسندوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو صرف بندوق کی زبان سے آشنا ہے اور جو مسائل کے سیاسی حل پر یقین نہیں رکھتا ہے۔ اور دوسری طرف آزاد ممالک کی دولت مشترکہ کی "امن افواج" کی چھتری تلے تاجکستان میں موجود روسی افواج کو حزبِ مخالف کے مسلح رضاکاروں کے خلاف پوری قوّت سے اور وسیع پیمانے پر فوجی کارروائی کرنے کے لیے جواز فراہم کیا جاسکے۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ موسم سرما کی آمد کے پیشِ نظر ویسے بھی حزبِ مخالف کی طرف سے گوریلا کارروائیاں جاری رکھنے کی صلاحیّت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

درحقیقت روسی قیادت اور وسطی ایشیا کے ممالک کے کمیونسٹ حکمرانوں نے تاجکستان کے حزبِ مخالف کی "اسلامی عسکریت پسندی" اور "مذہبی جنونیّت" و "بنیاد پرستی" کو اس حد تک اچھالا ہے کہ پوری دُنیا میں اپنے سیاسی افکار کے غلبہ کو دوام دینے کا خواہشمند مغرب اور امریکہ درپردہ نہ صرف تاجکستان بلکہ وسطی ایشیا کے دیگر تمام ممالک میں روس نواز کمیونسٹ حکمرانوں کو ان "مذہبی جنونیوں" کے استیصال میں ہر قسم کی مدد فراہم کر رہے ہیں۔ جمہوریت، سیاسی رواداری اور انسانی حقوق کی چمپین مغربی دارالحکومتوں میں سے کہیں سے بھی دوشنبہ کی غاصب اور سوویت عہد کے استبدادی ہتھکنڈوں پر عمل پیرا کمیونسٹ حکومت پر ۶ نومبر کے سوویت طرز پر نمائشی انتخابات اور ریفرنڈم کو ملتوی کر کے، سنجیدگی کے ساتھ حزبِ مخالف کے ساتھ پائیدار امن کے قیام کی شرائط طے کرنے کے لیے کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ تاجک حزبِ مخالف کو مغربی سیکولرازم کے خلاف ایک ایسا خطرہ سمجھتے ہیں جس کا استیصال بہرصورت ضروری ہے خواہ اس کے لیے جمہوریت اور دیگر "مغربی اقدار" کو بھی قربان کرنا پڑے۔ اس صورتِ حال میں حزبِ مخالف کے پاس حکومتی وفد کی طرف سے اصل لاینحل پر مذاکرات سے انکار کے باوجود جنگ بندی معاہدہ میں توسیع پر رضامندی کے سوا کوئی

چارہ کار نہیں تھا۔ کیونکہ بصورت دیگر ان پر "دہشت گرد" اور "اقتدار کے بھوکے" ہونے کے الزامات لگتے۔ گیارہ دن تک مسلسل مذاکرات کے بعد یکم نومبر کو جنگ بندی کمیشن کے قیام اور تین ماہ کے لیے جنگ بندی میں توسیع کے معاہدہ پر دستخط کرنے کے فوراً بعد حزبِ مخالف کے مذاکراتی وفد کے سربراہ قاضی اکبر توراجانزادہ نے کہا۔ "یہ ایک زبردستی مسلط کیا گیا معاہدہ ہے۔ ہمیں دیوار سے لگا دیا گیا تھا جہاں ہمارے پاس اس معاہدہ کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کیونکہ ہمارے لیے مسئلہ کو سیاسی طور پر حل کرنے کا یہ آخری موقعہ تھا"[۱]۔

تاجکستان میں حالات کو الجزائر اور افغانستان جیسے بحرانوں میں بدلنے سے بچانے کے لیے اقوام متحدہ، مغربی طاقتوں اور عالمِ اسلام کو فوری اقدامات کرنے ہوں گے۔ پاکستان کو خاص کر اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔ اسے روس اور مغربی پالیسی سازوں کی فراہم کردہ "لائن آف ایکشن" سے ہٹ کر خود پاکستان اور تاجکستان کے باہمی قومی مفادات کی نگہداشت کے حوالے سے تاجک بحران کو حل کرنے کی مخلصانہ کوششیں کرنی چاہئیں۔ ان کوششوں کا مقصد تنازع کے کسی ایک فریق کو دوسرے پر مسلط کرنا نہیں ہونا چاہیے۔ ملکوں کے درمیان باہمی خوشگوار تعلقات کی بنیاد حکومتیں نہیں بلکہ عوام ہوتے ہیں۔ ہم نے وسطی ایشیا کے مسلم عوام کے ساتھ اپنے تاریخی رشتوں کو ازسرِ نو استوار کرنا ہے اور اس عمل کو آگے بڑھانے کے لیے تاجکستان کا مسئلہ وہاں کے عوام کی امنگوں اور خواہشات کے مطابق حل ہونا انتہائی ضروری ہے۔ وسطی ایشیا کے عوام سوویت عہد کے سیاسی نظام کو آزادی کے بعد کسی بھی صورت جاری رکھنے پر رضامند نہیں ہیں۔ ستر سالہ سوویت دور استبداد کے بعد آزادی کی فضا میں سانس لینے کے بعد فطری طور پر ان کی خواہش ہے کہ وہ اس آزادی کو بھرپور طور پر محسوس کریں۔ وہ اپنے وطن میں اپنی حکمرانی اور اپنی اقدار، روایات اور تہذیبی ورثہ کی بالادستی دیکھنا اور محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے سیاسی، معاشی اور سماجی اداروں کو اپنے مذہبی عقائد سے ہم آہنگی کی بنیاد پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

آزادی کے بعد خاص کر ان کی ان خواہشات کا احترام کیا جانا انتہائی ضروری تھا۔ عوام کی ان خواہشات اور اُمنگوں کو "مذہبی بنیاد پرستی" کہہ کر حکومتی پالیسیوں سے اختلاف کرنے کے ان کے جمہوری حقوق کا انکار ہی تاجکستان میں پھوٹ پڑنے والی خانہ جنگی کا باعث بنا ہے۔ تاجکستان کی حزبِ مخالف کی سیاسی پارٹیاں نہ ہی "اسلامی عسکریت پسندوں" کا ٹولہ ہیں اور نہ ہی وہ ایسے "مذہبی بنیاد پرست" ہیں جو مذہبی پاپائیت کا پرچار کرتے ہوں۔ ان کا سیدھا سادھا مطالبہ یہ ہے کہ ملک میں جمہوری نظام رائج کر کے تمام سیاسی پارٹیوں کو مکمل آزادی سے کام کرنے دیا جائے۔ پریس مکمل طور پر حکومتی کنٹرول سے آزاد ہو اور بنیادی شہری اور انسانی حقوق بحال کیے جائیں۔ سابق سوویت عہد کے استبدادی ہتھکنڈوں کو خیر باد کہا جائے، اور آزادی کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر ملک کے لیے نئے آئین کی تشکیل کی جائے، جس کے مطابق مستقبل کے سیاسی نظام کے ڈھانچہ کی تعمیر کی جائے۔ عبوری دور میں ملک کا انتظام سنبھالنے کے لیے ایک ایسی قومی حکومت تشکیل دی جائے جس میں

حکمران کمیونسٹ پارٹی اور حزبِ مخالف کی سیاسی جماعتوں کو یکساں نمائندگی حاصل ہو اور جو ایک محدود مدّت میں جمہوری روایات کے مطابق آزادانہ انتخابات منعقد کروائے، اور ان انتخابات کے نتیجہ میں منتخب ہونے والی قیادت کو اقتدار سونپ دے۔

حزبِ مخالف کے اس سیاسی پروگرام سے کہیں بھی "مذہبی بنیاد پرستی" اور "اسلامی عسکریت پسندی" کی بو نہیں آتی۔ لیکن چونکہ ان کا یہ سیاسی پروگرام کمیونسٹ حکمرانوں کے لیے موت کا پیغام ہے اس لیے اُنہیں ہر صورت میں ملک کے سیاسی منظر سے دور رکھنا ان روس نواز کمیونسٹ حکمرانوں کا اوّلین مقصد بن کر رہ گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حزبِ مخالف میں اسلام پسند عناصر کا غلبہ ہے لیکن اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وسط ایشیائی عوام کی اکثریت کے لیے آزادی، خود داری، احترام باہمی، سیاسی رواداری اور بنیادی انسانی حقوق کا احترام اور دوسری پسندیدہ اقدار ہی کا دوسرا نام اسلام ہے۔ بنیادی اسلامی تعلیمات سے ناآشنائی کے باوجود اسلام سے ان کی محبت لامحدود ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو ستر سالہ دورِ استبداد میں اُنہیں محض اسلام کا نام لیوا ہونے ہی کی وجہ سے مسلسل مشقِ ستم بنایا گیا۔ آج تاجک، ازبک، ترکمان، کرغیز، قزاق اور سابق سوویت یونین کی دیگر مسلم قومیتیں اپنی شناخت اور اپنی تہذیب و ثقافت کی بازیافت کے عمل سے گزر رہی ہیں۔ وہ اپنی پہچان کی جنگ لڑ رہی ہیں۔ اور اس عمل میں مذہب اسلام اور اس کی روحانی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کی طرف واپسی کے بغیر وہ کسی قسم کی پیش رفت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ وسطی ایشیا کے ان ممالک کے عوام میں مذہب اسلام کی طرف واپسی اور دین سے وابستگی کے جو نئے رجحانات نظر میں آ رہے ہیں اور جسے اہلِ مغرب "ابھرتی ہوئی اسلامی بنیاد پرستی" سے تعبیر کرتے ہیں، وہ دراصل اپنی ثقافتی روایات اور تاریخی ورثہ کو دوبارہ دریافت کرنے اور اپنے اس اسلامی تشخص کو مستحکم کرنے کی خواہشات کی مظہر ہے جسے اُنہوں نے روسی غلامی کے دورِ استبداد میں بھی انتہائی ناساعد حالات کے باوجود برقرار رکھا۔ وسطی ایشیا کے ان نو آزاد مسلم ممالک میں کمیونسٹ حکمرانوں نے اگرچہ یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان ممالک کا سیاسی نظام آزادی کے بعد بھی بدستور سیکولر بنیادوں پر چلایا جائے گا لیکن بقول جناب آصف جیلانی "عوام کی سطح پر البتہ فیصلہ مختلف ہے۔ عوام نے کھلم کھلا فیصلہ اپنے اسلامی تشخص کے حق میں دیا ہے"۲۔ سوویت یونین کے زوال سے بھی ایک دہائی قبل سابق سوویت یونین کے مسلمانوں کے معاملات کے ماہر مغربی دانشور الگزنڈر بنگسن نے لکھا تھا:

> " It is still believed in Central Asia, as well as in the Caucasus, that a non- Muslim cannot be an Uzbik or a Kirghiz or a Turkmen which goes to prove that Muslim consciousness continues to enjoy priority in the minds of Central Asians and Caucasians".

یعنی "وسطی ایشیا اور قفقاز میں [کمیونسٹوں کے زبردست مذہب مخالف اقدامات اور الحادی پروپیگنڈہ کے باوجود] ابھی تک یہ عقیدہ ہے کہ کوئی بھی غیر مسلم ازبک، کرغیز یا ترکمن نہیں ہو سکتا۔ اور یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اسلامی شعور کو ابھی تک وسط ایشیا اور قفقاز کے [مسلم] عوام کے قلب و دماغ میں ترجیحی مقام حاصل ہے"[۳]۔

دراصل وسطی ایشیا کے معاشروں میں اسلام اور اسلامی اقدار تہذیب و ثقافت کا ایک جزولاینفک ہے جن کے بغیر یہاں کی مختلف قومیتیں اور لسانی گروہ اپنی شناخت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتیں۔ سوویت دور میں ازبکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک اہل کار نے کہا تھا۔

" The Mualim religion is the mother of the Uzbik people" (مسلم مذہب [اسلام] ازبک لوگوں کے لیے "ماں" کی حیثیت رکھتا ہے[۴]۔)

اس تناظر میں تاجکستان اور دوسری وسط ایشیائی ریاستوں کے عوام میں اُبھرنے والے مذہبی جذبات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو روسیوں اور مغربی دانشوروں کی طرف سے وسطی ایشیا میں اُبھرتی ہوئی اسلامی بنیاد پرستی سے متعلق پروپیگنڈہ کے مقاصد سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ دراصل اس روسی اور مغربی پروپیگنڈہ کا مقصد وسطی ایشیا کے ان نوآزاد ممالک میں لادین کمیونسٹ عناصر کے اقتدار کو دوام بخشنا ہے۔ خود یہاں کے اعتدال پسند کمیونسٹ عناصر عوام کی طرف سے اسلام سے وابستگی اور عقیدت و محبت کے جذبات کے اظہار کو "اسلامی بنیاد پرستی" کے نام سے پکارنے کو غلط قرار دیتے ہیں۔ آزادی کے بعد تاجکستان کے پہلے کمیونسٹ صدر جناب رحمن نبی یوف کی حکومت میں نائب وزیر خارجہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والے ایک کمیونسٹ جناب رحمت اللہ اسیوف کے مطابق "چونکہ مغرب میں اخبارات تاجکستان میں اسلامی رجحان کے بارے میں صحیح طور پر واقف نہیں ہیں اس لیے وہ یہاں کے عوام کے اسلامی جذبات کو بنیاد پرستی سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ تاجکستان میں اسلام کا نعرہ لگانے والوں کو [اسلامی] بنیاد پرست نہیں قرار دیا جا سکتا"[۵]۔ امریکی سینٹ کے رکن ایلن کرانسٹن (Alan Cranston) نے ۱۹۹۲ء میں وسط ایشیائی ریاستوں کے دورے کے بعد امریکی سینٹ کی اُمور خارجہ کمیٹی کو اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے لکھا:

" Islamic fandamentalism is often ranked by westerners as the most serious threat in each of these Countries. My meetings revealed Little evidence of this, however,although certain leaders were not above using the bugaboo of fundamentalism to justify repressive policies."

"مغربی دانشور اکثر اِن [وسط ایشیائی] ریاستوں میں سے ہر ایک میں اسلامی بنیاد پرستی کو ایک حقیقی خطرہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ میری ملاقاتوں میں اِس بات کے بہت کم شواہد ملے۔ اگرچہ بعض زعماء اپنی جابرانہ پالیسیوں کے لیے جواز کے طور پر بنیاد پرستی کے مزعومہ خطرے کو استعمال کرتے رہے"[٦]۔

زار شاہی اور بعد ازاں سابق سوویت یونین کے کمیونسٹ عہد میں اسلام کو مذہب اور ایک جداگانہ تہذیب و ثقافت کی حیثیت سے مکمل طور پر یہاں کے مسلم عوام کے ذہنوں سے محو کر کے ان پر کمیونسٹ الحادی تہذیب مسلط کرنے کی منظم کوششیں کی گئیں۔ ان کوششوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اسلام کو کسی نہ کسی شکل میں اپنی زندگیوں میں زندہ رکھنے کے لیے یہاں کے مسلم عوام نے مختلف اوقات میں حالات کی مناسبت سے مختلف انداز میں مزاحمتی تحریکیں برپا کیں۔ ۱۹۹۱ء میں آزادی ملنے کے بعد وسطی ایشیا کے تمام نوآزاد ممالک میں بالعموم اور تاجکستان میں بالخصوص اسلام سے وابستگی کے شدید جذبات کا اظہار بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں پرانے لادین کمیونسٹ عناصر کے بدستور اقتدار سے چمٹے رہنے پر اصرار کے خلاف عوامی مزاحمت کی ایک نئی شکل ہے۔ ان عوامی جذبات کا صحیح ادراک کرنے کے لیے اسی تاریخی پسِ منظر میں ان کا تجزیہ کیا جانا چاہیے۔ اسلام کی طرف مکمل واپسی کے ان ملّی جذبات کو مزید برانگیختہ کرنے میں انقلاب ایران اور جہاد افغانستان کا بھی حصّہ ہو سکتا ہے لیکن یہ کہنا تاریخی حقائق کے انکار کے مترادف ہو گا کہ اسلام پسندی کے یہ جذبات مکمل طور پر ان بیرونی عوامل کا شاخسانہ ہیں۔ سابق سوویت یونین میں تعلیم حاصل کرنے والی یونیورسٹی آف لندن کی سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کی بنگلہ دیشی لیکچرار ڈاکٹر شیرین اکینر کے بقول:

"---ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس کی بنیاد پر [وسطی ایشیا کی] تحریک [اسلامی] کو سوویت مادہ پرستی کے چھوڑے ہوئے خلاء سے نمٹنے کے لیے [بیرونی تحریکات سے متأثر ہوئے بغیر] داخلی طور پر پروان چڑھنے والی ایک مقامی تحریک کے علاوہ کوئی اور نام دیا جا سکے"[٧]۔

شاید ہم اپنے موضوع سے ہٹ گئے ہیں لیکن تاجک حزبِ اختلاف پر اسلامی بنیاد پرستوں کا ٹولہ ہونے کے حوالے سے لگائے جانے والے روسی اور مغربی الزامات کے تناظر میں یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے تاکہ تاجکستان کے بحران کو اس کے اصل پسِ منظر میں سمجھنے میں آسانی ہو۔ اور اس سلسلہ میں پڑوس کے اسلامی ممالک کی طرف سے کی جانے والی مصالحت کی کوششوں کو صحیح سمت میں مرکوز کرنے کے عمل میں مدد مل سکے۔ اسلام آباد مذاکرات میں تاجکستان کے حکومتی وفد کی ہٹ دھرمی کے باعث اِن مذاکرات کے لیے طے کردہ ایجنڈہ میں شامل اہم اُمور میں سے کسی پر بھی بات چیت نہیں ہو سکی۔ بعض اخباری رپورٹوں میں تو یہاں تک کہا گیا کہ حزبِ مخالف کی طرف سے ٦ نومبر کے

انتخابات کے التواء اور اقوام متحدہ کی نگرانی میں سویلین آبادی کے لیے محفوظ علاقے (Safe Areas) قائم کرنے جیسے اہم معاملات کو مذاکرات کے ایجنڈہ میں شامل کرنے پر اصرار کے جواب میں اقوام متحدہ کے اہل کاروں نے مذاکرات کی سرپرستی سے دستکش ہونے کی دھمکی دی تھی[8]۔ بہرحال اب جب کہ جنگ بندی میں توسیع ہو چکی ہے، بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ مذاکرات کے اگلے دور میں مسئلہ کے بنیادی اسباب کو ختم کرنے پر توجہ مرکوز کی جائے۔ تاجک عوام کی خواہشات اور ملی جذبات کا احترام کرتے ہوئے سابق سوویت عہد کے کمیونسٹ سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلیوں پر سنجیدہ مذاکرات کا آغاز تاجکستان میں قیام امن کی طرف پیش رفت کا پہلا زینہ ثابت ہوگا۔ لیکن بظاہر یوں لگتا ہے کہ تاجکستان کی کمیونسٹ قیادت مسئلہ کو مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے کے دعووں میں مخلص نہیں ہے۔ اس نے حزب مخالف کے ساتھ مذاکرات کے نتیجے میں نئے آئین کی تشکیل سے قبل ہی پروگرام کے مطابق صدارتی انتخابات اور صدر کے عہدہ کی بحالی کے لیے ریفرنڈم منعقد کروا لیے ہیں۔ گو یہ انتخابی عمل اس حد تک نمائشی تھا کہ بین الاقوامی برادری اور CSCE [کانفرنس آن سیکورٹی اینڈ کوآپریشن ان یورپ] نے یہ کہہ کر اپنے مبصر بھجوانے سے انکار کر دیا تھا کہ "آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کروانے کے لیے ضروری شرائط پوری نہیں کی گئیں"[9]۔

ان انتخابات کی حیثیت ایک ایسی نورا کشتی کی تھی جس میں صدر رحمانوف کے ایک دیرینہ ساتھی اور ماسکو میں سفیر کی حیثیت سے صدر رحمانوف ہی کی حکومت کی نمائندگی کرنے والے ایک سرکاری ملازم جناب عبدالمالک عبداللہ جانوف کو، روسی حکومت کی وساطت سے ان کے ساتھ خفیہ مذاکرات کے نتیجے میں، صدر کے مقابلہ میں انتخاب لڑنے کے لیے نامزد کیا گیا۔ اور پھر طے شدہ طریقہ کار کے مطابق ایک ایسے تناسب سے ان کے حق میں ووٹ ڈلوائے گئے جس سے ایک طرف رائے دہندگان کی آزادی کا تأثر دیا گیا اور دوسری طرف صدر رحمانوف کی قصر صدارت میں واپسی کا بندوبست کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات انتہائی اہم ہے کہ صدر رحمانوف اور عبدالمالک عبداللہ جانوف دونوں کا تعلق کلیاب اور خوجند (لینن آباد) کے ان علاقوں سے ہے جو کمیونسٹوں کا گڑھ ہیں اور جو ہمیشہ سے سوویت عہد میں تاجکستان پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ اور یوں انتخابات کے اس عمل میں تاجک بحران کے دوسرے فریق یعنی جرمیوں اور پامیریوں کو کسی قسم کی نمائندگی حاصل نہیں تھی[10]۔ مزید یہ کہ یہ انتخابات ایسے وقت میں کرائے گئے جب کہ حزب مخالف سے ہمدردی رکھنے والے اکثر تاجک شہری رحمانوف حکومت کے ظلم و ستم سے جان بچانے کے لیے افغانستان اور آزاد ممالک کی دولت مشترکہ کے دیگر ممالک میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ حزب مخالف کے لیڈر قاضی اکبر توراجانزادہ کے مطابق صرف سابق سوویت ریاستوں میں پناہ لینے والے تاجک مہاجرین کی تعداد آٹھ لاکھ سینتالیس ہزار [۸۴۷،۰۰۰] ہے جو ملک کے کل رائے دہندگان کا تیس فیصد حصّہ بنتے ہیں اور مجموعی آبادی کا بیس فیصد حصّہ۔ افغانستان میں پناہ لینے والے مہاجرین ان کے علاوہ ہیں"۔

دوشنبہ کے حکمران اپنے ہی انداز سے "بحران کو حل کرنے" کی طرف پیش رفت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اِن کی سوچ کے مطابق مذاکرات کے آئندہ دور کی آمد سے قبل ہی اُنھوں نے اپنے اقتدار کو Legetimise کرالیا ہے۔ ان کے خیال میں جنگ بندی کی توسیع کے نتیجے میں اور نسبتاً پُرامن حالات کی وجہ سے حزبِ مخالف کے جنگجوؤں کی ایک تعداد متوقع طور پر اپنے گھروں کو واپس لوٹ آئے گی جبکہ ایک تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جو فراغت اور فرصت کے ان لمحات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسب معاش اور روزگار کے مواقع کی تلاش میں نکل جائیں گے۔ روسی فوجوں کی تاجکستان سے واپسی کے مطالبہ سے ویسے ہی حزبِ مخالف دستبردار ہو گئی ہے۔ اِن حالات میں عین ممکن ہے کہ مذاکرات کے اگلے دور میں دوشنبہ کے حکمرانوں اور ان کے روسی آقاؤں کا حزبِ مخالف کے ساتھ مزید سخت روّیہ مذاکرات کی یکسر ناکامی کا سبب بن جائے گا۔

حواشی

1. *The Muslim*, Nov. 2, 1994.

۲۔ آصف جیلانی، وسط ایشیا: نئی آزادی، نئے چیلنج، ۱۹۹۴ء لاہور۔

3. Alexcnder Bennigsen and Marry Broxap, *The Islamic Threat to Soviet State*, 1983, (reprint) Lahore, p. 137.

4. Elizabeth E. Bacon, *Central Asians Under Russian Rule: A Study in Cultural Change*, 1980, London p. 176

۵۔ آصف جیلانی، حوالہ بالا ص ۱۰۲

6. Nasim Zehra, "Untying the Tajikistan Knot", *The News*, Nov 14, 1994.

۷۔ ڈاکٹر شیریں اکینز کی زیرِ ادارت British Academic Press سے شائع ہونے والی (وسط ایشیائی ممالک کے اقتصادی اور سیاسی رجحات سے متعلق) تازہ ترین کتاب "*Political and Economic Trends in Central Asia*" (۱۹۹۴ء) کے Epilogue میں محترمہ شیریں اکینز لکھتی ہیں۔

In the mid-1080, however, small numbers of individuals, many of them in their twenties and thirties, begun to turn to Islam, to learn what they could about the religion and to try to live according to its precept. The phenomenon was noted in Uzbekistan and Tadzhikistan, but was possibly not exclusive to those republics,. In the press, these groups were referred to as 'Wahabbis', implying that they were fanatics and also traitors, agents of an unspecified, foreign power. It was not a term used by these so-called 'Wahabbis' themselves, however, and there is no evidence to suggest that the movement was anything but a spontaneous, indigenous response to the spiritual vacuum created by soveit materialism." p.185

۸۔ ماہنامہ الجہاد [عربی]، پشاور، نمبر ۱۱۴ دسمبر ۱۹۹۴ء ص ۳۷

9. *The News*, Islamabad, Nov 7, 1994

10. Dr. Hafeez Malik, "Pakistan's Security Interests in Tajikistan-1" *The Muslim*, Nov 2, 1994

۱۱۔ ماہنامہ الجہاد، پشاور، دسمبر ۱۹۹۴ء ص ۳۶